خود کلامی

پروین شاکر

خود کلامی

پروین شاکر

اشاعت : فبروری ۱۹۹۴ء
تعداد : ۱۰۰۰ ر
طباعت : اسپیڈ پرنٹس، سعید آباد، حیدرآباد
ناشر : حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد-۲ (اے پی)

م ر ا د

تیرے نام!

ترتیب

کچھ تو ہوا بھی سرد تھی، کچھ تھا ترا خیال بھی
دل کو خوشی کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا ملال بھی

بات وہ آدھی رات کی، رات وہ پورے چاند کی
چاند بھی عین چیت کا اُس پہ ترا جمال بھی

سب سے نظر بچا کے وہ مجھ کو کچھ ایسے دیکھتا
ایک دفعہ تو رُک گئی گردشِ ماہ و سال بھی

دل تو چمک سکے گا کیا، پھر بھی ترش کے دیکھ لیں
شیشہ گرانِ شہر کے ہاتھ کا یہ کمال بھی

اُس کو نہ پا سکے تھے جب دل کا عجیب حال تھا
اب جو پلٹ کے دیکھئے بات تھی کچھ محال بھی

میری طلب تھا ایک شخص وہ جو نہیں ملا تو پھر
ہاتھ دعا سے یوں گرا، بھُول گیا سوال بھی

اُس کی سخن طرازیاں میرے لئے بھی ڈھال تھیں
اُس کی ہنسی میں چھُپ گیا اپنے غموں کا حال بھی

گاہ قریبِ شاہ رگ، گاہ بعیدِ وہم و خواب
اُس کی رفاقتوں میں رات، ہجر بھی تھا وصال بھی

اُس کے ہی بازوؤں میں اور اُس کو ہی سوچتے رہے
جسم کی خواہشوں پہ تھے رُوح کے اور جال بھی

شام کی نا سمجھ ہوا پوچھ رہی ہے اِک پتا
موجِ ہوائے کوئے یار، کچھ تو مرا خیال بھی

دو (۲) ساحلی نظمیں

(۱)

پہلے چاند کی نرم مہکتی رات
سبک ساحل کی ٹھنڈک
اور خوش لمس ہوا
تن کی چاہ میں جلنے والی
دو پیاسی روحوں کو ایسے چھونے لگی تھی
جیسے اُن کا دُکھ پہچان گئی ہو!

(۲)

جس جذبے پر
دن بھر سورج اپنے ہاتھ رکھے رہتا تھا
شب کے لمس سے ایسے جاگ پڑا تھا
ریت کی دلآرام رفاقت
اور سلگتی تنہائی کے بیچ
سمندر کی بانہوں سے لپٹے ہوئے دو منکر جسم
اپنے آپ سے ہار چکے تھے
رات کا جادو جیت چکا تھا!

آلامِ حیات ۔ لوٹ آئیں
آسائشیں مجھ کو کھا نہ جائیں

کیا ایسی تلاشِ آب و دانہ
پرواز کا لطف بھول جائیں

تو مقتلِ شب سے آ رہی ہے
اے صبح ! تجھے گلے لگائیں

آسان سہی بچھڑ کے رہنا
پر اُس کا سا دل کہاں سے لائیں

جب ہم کسی اور کا بُوئے رزق
کس کے لیے زندگی کمائیں

معلوم، کہ چھوڑنا ہے اِک دن
پھر بھی یہ لگن کہ گھر بنائیں

بستی میں اُتر رہا ہے پانی
ہم اور کہاں اُتر کے جائیں

پانی ہے، ہوا ہے یا خلا ہے
ہم اپنے قدم کہاں جمائیں

یوں حوصلہ دل نے ہارا کب تھا
سرطان مرا ستارا کب تھا

لازم تھا گزرنا زندگی سے
بن زہر پیے گزارا کب تھا

کچھ پل اُسے اور دیکھ سکتے
اشکوں کو مگر گوارا کب تھا

ہم خود بھی جدائی کا سبب تھے
اُس کا ہی قصور سارا کب تھا

اب اور کے ساتھ ہے تو کیا دُکھ
پہلے بھی کوئی ہمارا کب تھا

اِک نام پہ زخم کھِل اُٹھے تھے
قاتل کی طرف اشارا کب تھا

آئے ہو تو روشنی ہُوئی ہے
اِس بام پہ کوئی تارا کب تھا

دیکھا ہوا گھر تھا پر کسی نے
دُلہن کی طرح سنوارا کب تھا

کُھلے گی اُس نظر پہ چشمِ تر آہستہ آہستہ
کیا جاتا ہے پانی میں سفر آہستہ آہستہ

کوئی زنجیر پھر واپس وہیں پر لے کے آتی ہے
کٹھن ہو راہ تو چھُٹتا ہے گھر آہستہ آہستہ

بدل دینا ہے رستہ یا کہیں پر بیٹھ جانا ہے
کہ تھکتا جا رہا ہے ہم سفر آہستہ آہستہ

خلش کے ساتھ اِس دل سے نہ میری جاں نکل جائے
کھنچے تیرِ شناسائی مگر آہستہ آہستہ

ہَوا سے سرکشی میں پھول کا اپنا زیاں دیکھا
سو جھکتا جا رہا ہے اب یہ سر آہستہ آہستہ

جواز

کتنی سنسان زندگی تھی

سب طاق مرے دیے سے خالی
بے برگ و ثمر بدن کی ڈالی
کھڑکی پہ نہ آ کے بیٹھے چڑیا
آنگن میں بھٹک سکے نہ تتلی
سنجوگ کی بے نمو رتوں سے
میں کتنی اداس ہو چلی تھی

آواز کے سیلِ بے پنہ میں
میں تھی، مرے گھر کی خامشی تھی

پر دیکھ تو آ کے لال میرے
اس کلبۂ غم میں مجھ کو تیرے
آنے کی نوید کیا ملی ہے
جینے کا جواز مل گیا ہے!

میرا لال

میرے زرد آنگن میں
سرخ پھول کی خوشبو
نقرئی کرن بن کر
کاسنی دنوں کی یاد
سبز کرتی جاتی ہے!

تیری موہنی صُورت

ہاں مجھے نہیں پروا
اب کسی اندھیرے کی
آنے والی راتوں کے
سب اُداس رستوں پر
ایک چاند روشن ہے
تیری موہنی صُورت!

کائنات کے خالق!

کائنات کے خالق!
دیکھ تو مرا چہرہ
آج میرے ہونٹوں پر
کیسی مسکراہٹ ہے
آج میری آنکھوں میں
کیسی جگمگاہٹ ہے
میری مسکراہٹ سے
تجھ کو یاد کیا آیا

میری بھیگی آنکھوں میں
تجھ کو کچھ نظر آیا
اس حسین لمحے کو
تُو تو جانتا ہو گا
اس سمے کی عظمت کو
تُو تو مانتا ہو گا

ہاں — ترا گماں سچ ہے
ہاں — کہ آج میں نے بھی
زندگی جنم دی ہے!

اب بھلا چھوڑ کے گھر کیا کرتے
شام کے وقت سفر کیا کرتے

تیری مصروفیتیں جانتے ہیں
اپنے آنے کی خبر کیا کرتے

جب ستارے ہی نہیں مل پائے
لے کے ہم شمس و قمر کیا کرتے

وہ مسافر ہی کُھلی دھوپ کا تھا
سائے پھیلا کے شجر کیا کرتے

خاک ہی اوّل و آخر ٹھہری
کر کے ذرّے کو گہر کیا کرتے

رائے پہلے سے بنا لی تُو نے
دل میں اب ہم ترے گھر کیا کرتے

عشق نے سارے سلیقے بخشے
حسن سے کسبِ ہنر کیا کرتے

ہم سفر چھوٹ گئے راہگزر کے ہمراہ
کوئی منظر نہ چلا دیدۂ تر کے ہمراہ

ایسا لگتا ہے کہ پیروں سے لپٹ آئی ہے
ایک زنجیر بھی اسبابِ سفر کے ہمراہ

اتنا مشکل تو نہ تھا میرا پلٹنا لیکن
یاد آجاتے ہیں رستے بھی تو گھر کے ہمراہ

کس سے تصدیق کروں شہر کی بربادی کی
اب تو قاصد بھی نہیں ہوتے خبر کے ہمراہ

ہم نے جنگل میں بھی پیچھے نہیں مُڑ کر دیکھا
کیا عجب عزم بندھا رختِ سفر کے ہمراہ

اِک نہ اِک روز تو رخصت کرتا
مجھ سے کتنی ہی محبّت کرتا

سب رُتیں آ کے چلی جاتی ہیں
موسم غم بھی تو ہجرت کرتا

بھیڑیے مجھ کو کہاں پا سکتے
وہ اگر میری حفاظت کرتا

میرے لہجے میں غرور آیا تھا
اس کو حق تھا کہ شکایت کرتا

کچھ تو تھی میری خطا ورنہ وہ کیوں
اس طرح ترکِ رفاقت کرتا

اور اُس سے نہ رہی کوئی طلب
بس مرے پیار کی عزت کرتا

کسے خبر تھی

(سرور بارہ بنکوی کے لئے ایک نظم)

وہ زرد موسم کی آخری شب
ہجومِ ہم خوابگاں میں بیٹھا
بہار کے پہلے پھول کا ذکر کر رہا تھا
اور اپنے کل کے لئے سنہری شگون لینے کو
اس کے کِھلنے کا منتظر تھا

کسے خبر تھی
کہ اب کے موسم
بہار کے پہلے پھول کو بھی
شگفت کے معجزے کی خاطر
اُسی کی مٹی کا آسرا تھا!

مِسفِٹ ؎۱

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں
مجھ میں لوگوں کو خوش رکھنے کا ملکہ
اتنا کم کیوں ہے
کچھ لفظوں سے، کچھ میرے لہجے سے خفا ہیں
پہلے میری ماں
میری مصروفیت سے
نالاں رہتی تھی
اب یہی گلہ مجھ سے میرے بیٹے کو ہے !
(رزق کی اندھی دوڑ میں رشتے کتنے پیچھے رہ جاتے ہیں)

؎۱ MISFIT

جب کہ صورتِ حال تو یہ ہے
میرا گھر
میرے عورت ہونے کی مجبوری کا
پورا لطف اٹھاتا ہے
ہر صبح
میرے شانوں پر
ذمہ داری کا بوجھ لیکن
پہلے سے بھاری ہوتا ہے
پھر بھی میری پشت پہ
نااہلی کا کوب
روز بروز نمایاں ہوتا جاتا ہے!

پھر میرا دفتر ہے
جہاں تقرر کی پہلی ہی شرط کے طور پہ
خود داری کا استعفےٰ داخل کرنا تھا

میں بنجر ذہنوں میں پھول اگانے کی کوشش کرتی ہوں
کبھی کبھی ہریالی دِکھ جاتی ہے

ورنہ

پتّھر
بارش سے اکثر ناراض ہی رہتے ہیں

مراقبیلہ
میرے حرف میں روشنی ڈھونڈ نکالتا ہے
لیکن مجھ کو
اچھی طرح معلوم ہے

ان میں
کس کی نظریں لفظ پہ ہیں
اور کس کی لفظ کی خالق پر
سارے دائرے میرے پاؤں سے چھوٹے ہیں
لیکن وقت کا وحشی ناچ
کسی مقام نہیں رُکتا

رقص کی لَے ہر لمحہ تیز ہوئی جاتی ہے
یا تو میں کچھ اور ہُوں
یا پھر
یہ میرا سیارہ نہیں ہے!

اختیار کی ایک کوشش

اگر بن میں رہنا مقدّر ہے
اور یہ اک طے شدہ امر بھی ہے
کہ ہر بن میں بس بھیڑیے منتظر ہیں مرے
تو یہ سوچتی ہوں
کہ اس صورتِ حال میں
کیوں نہ پھر
اپنی مرضی کے جنگل میں ہی جا بسوں!

نئے سال کی پہلی نظم

اندیشوں کے دروازوں پر
کوئی نشان لگاتا ہے
اور راتوں رات تمام گھروں پر
وہی سیاہی پھر جاتی ہے

دکھ کا شب خوں روز ادھورا رہ جاتا ہے
اور شناخت کا لمحہ بیتتا جاتا ہے

میں اور میرا شہرِ محبت

تاریکی کی چادر اوڑھے

روشنی کی آہٹ پر کان لگائے کب سے بیٹھے ہیں

گھوڑوں کی ٹاپوں کو سنتے رہتے ہیں!

حدِ سماعت سے آگے جانے والی آوازوں کے ریشم سے

اپنی ردائے سیاہ پہ تارے کاڑھتے رہتے ہیں

انگشتانے اِک اِک کر کے چھلنی ہونے کو آئے

اب باری انگشتِ شہادت کی آنے والی ہے

صبح سے پہلے وہ کٹنے سے بچ جائے — تو!

وقت کے ساتھ عناصر بھی رہے سازش میں
جل گئے پیڑ کبھی دھوپ کبھی بارش میں

وہ تو اک سادہ و کم شوق کا طالب نکلا
ہم نے ناحق ہی گنوایا اُسے آرائش میں

زندگی کی کوئی محرومی نہیں یاد آئی
جب تلک ہم تھے ترے قرب کی آسائش میں

ایک دُنیا کا قصیدہ تھا اگرچہ مرے نام
لطف آتا تھا کسی شخص کی فہمائش میں

اس کی آنکھیں بھی مری طرح سے گروی کہیں اور
خواب کا قرض بڑھا جاتا ہے اک خواہش میں

الزام تھا دیے پہ نہ تقصیرِ رات کی
ہم نے تو بس ہوا کے تعلق سے بات کی

ہر صبح جب کہ صبحِ قیامت کی طرح آئے
ایسے میں کون ہو گا جو سوچے ثبات کی

تکلیف تو ہُوئی مگر اے ناخنِ ملال
کُھلنے لگی گرہ بھی کوئی اپنی ذات کی

زنجیر ہے جزیرہ ہے یا شاخِ بے ثمر
اب کون سی لکیر سلامت ہے ہات کی

مرنے اگر نہ پائی تو زندہ بھی کب رہی
تنہا کٹی وہ عمر جو تھی تیرے سات کی

پھر بھی نہ میرا قافلہ لٹنے سے بچ سکا
میں نے خبر تو رکھی تھی ایک ایک گھات کی

اِک لمحہ تو پتھر بھی خوں رو جائے
جب خوابوں کا سونا مٹی ہو جائے

اِک ایسی بارش ہو میرے شہر پہ جو
سارے دل اور سارے دریچے دھو جائے

پہرہ دیتے رہتے ہیں جب تک خدشے
کیسے رات کے ساتھ کوئی پھر سو جائے

بارش اور نمو تو اس کے ہاتھ میں ہیں
مٹی میں پر بیج تو کوئی بو جائے

تین رُتوں تک ماں جس کا رستہ دیکھے
وہ بچہ چوتھے موسم میں کھو جائے

وہ

اِک لمبے سفر کی دھوپ سر پہ
آنکھوں میں گلابی رتجگوں کی
ملبوس پہ گردِ راستوں کی
شانوں پہ تھکن مسافتوں کی

آواز میں جھیل جیسا ٹھہراؤ
سینے میں چھپائے زخمِ خنداں
میلے میں خود اپنے سے بچھڑ کے
دامن مرا تھام کر کھڑا ہے
بچے کی طرح ملول و مسرور!

ساتھ

کتنی دیر تک
املتاس کے پیڑ کے نیچے
بیٹھ کے ہم نے باتیں کیں
کچھ یاد نہیں
بس اتنا اندازہ ہے
چاند ہماری پشت سے ہو کر
آنکھوں تک آپہنچا تھا!

اُس کی آواز

کتنی شفاف ہے یہ آواز
چشمے کی طرح سے، جس نے میرے
اندر کے تمام موسموں کو
آئینہ بنا کے رکھ دیا ہے

پتھر ہو کہ پھول ہو کہ سبزہ
تاروں کی برات ہو کہ مہتاب

سورج کا جلال ہو کہ تن میں
خوابوں کی دھنک کھنچی ہوئی ہو
بارش ہو، شفق کھلی ہوئی ہو
ہر رُت کا گواہ: اُس کا لہجہ
تہہ تک جیسے آنکھ چھُو کے آئے
کتنی شفاف ہے یہ آواز!

سرشاری

ہاں، یہ موسم تو وہ ہے
کہ جس میں نظر چپ رہے
اور بدن بات کرتا رہے
اُس کے ہاتھوں کے شبنم پیالوں میں
چہرہ مرا
پھول کی طرح ہلکورے لیتا رہے
پنکھڑی پنکھڑی

اُس کے بوسوں کی بارش میں
پیہم نکھرتی رہے
زندگی اس جنوں خیز بارش کے شانوں پہ سر کو رکھے
رقص کرتی رہے!

آتش بجاں

آگ باقی عناصر پہ کچھ ایسی حاوی ہے
کہ جیسے بدن میں
لہو کی جگہ
کوئی سیّال آتش رواں ہے
ایک تن دوسرے تن کی خواہش میں
صدیوں سے طے یافتہ کیمیا
بھولتا جا رہا ہے
ایک خواہش ہے جس کے تپاں چاک پر

گھومتا جا رہا ہے
ایک شعلہ
کہ مٹی، ہوا اور پانی کی حد چاٹتا جا رہا ہے
زندگی جیسے اب صرف اِک نام ہے
جس پہ دل
جُھومتا جا رہا ہے!

بے بسی کی ایک نظم

کیا اُس پہ میرا بس ہے
وہ پیڑ گھنا
لیکن کسی اور کے آنگن کا
کیا پھول مرے
کیا پھل میرے
سایہ تک چھونے سے پہلے
دنیا کی ہر اُنگلی مجھ پر اُٹھ جائے گی
وہ چھت کسی اور کے گھر کی
بارش ہو کہ دھوپ کا موسم

مرے اِک اِک دن کے دوپٹے
آنسو میں رنگے
آہوں میں سُکھائے جائیں گے
تہہ خانۂ غم کے اندر

سب جانتی ہوں
لیکن پھر بھی
وہ ہاتھ کسی کے ہاتھ میں جب بھی دیکھتی ہوں
اِک پیڑ کی شاخوں پر
بجلی سی لپکتی ہے
اِک چھوٹے سے گھر کی
چھت بیٹھنے لگتی ہے!

اے رمز بھری رات

جس صبح کی آواز میں بارش کی کھنک ہو
اُس دن کا بدن دیکھیے سُر کیسے ہُوا ہو
جس شام کے ماتھے پہ کھلے وصل کا تارا
اُس رات کے اقرار کی کیا صورتیں ہوں گی
اے بھید بھرے دن مرے
اے رمز بھری رات
یہ ماہ زدہ ۔ مہر گزیدہ دل وحشی
پھر کون سے جادو کے اثر میں ہے گرفتار
برسات میں جلتے ہُوئے جنگل کے کنارے
کس قاف کے باشندے سے ٹھہری ہے ملاقات!

بے فیض رفاقت میں ثمر کس کے لئے تھا
جب دھوپ تھی قسمت تو شجر کس کے لئے تھا

پردیس میں سونا تھا تو چھت کس لئے ڈالی
باہر ہی نکلنا تھا تو گھر کس کے لئے تھا

جس خاک سے پھوٹا ہے اُسی خاک کی خوشبو
پہچان نہ پایا تو ہُنر کس کے لئے تھا

اے مادرِ گیتی! تری حیرت بھی بجا ہے
تیرے ہی نہ کام آیا تو سر کس کے لئے تھا

یوں شام کی دہشت سے سرِ دشت ارادہ
رُکنا تھا۔ تو پھر سارا سفر کس کے لئے تھا

شاید اُس نے مجھ کو تنہا دیکھ لیا ہے
دُکھ نے میرے گھر کا رستا دیکھ لیا ہے

اپنے آپ سے آنکھ چُرائے پھرتی ہُوں میں
آئینے میں کِس کا چہرہ دیکھ لیا ہے

اب بھی پہلے ہوئے تو ایمان ہے اُس کا
اُس نے ان آنکھوں میں صحرا دیکھ لیا ہے

اُس نے مجھے دراصل کبھی چاہا ہی نہیں تھا
خود کو دے کر یہ بھی دھوکا، دیکھ لیا ہے

اُس سے ملتے وقت کا رونا کچھ فطری تھا
اُس سے بچھڑ جانے کا نتیجہ دیکھ لیا ہے

رخصت کرنے کے آداب نبھانے ہی تھے
بند آنکھوں سے اُس کو جاتا دیکھ لیا ہے

کیا کرے میری مسیحائی بھی کرنے والا
زخم ہی یہ مجھے لگتا نہیں بھرنے والا

زندگی سے کسی سمجھوتے کے باوصف اب تک
یاد آتا ہے کوئی مارنے مرنے والا

اُس کو بھی ہم ترے کوچے میں گزار آئے ہیں
زندگی میں وہ جو لمحہ تھا سنورنے والا

اُس کا اندازِ سخن سب سے جُدا تھا شاید
بات لگتی ہوئی، لہجہ وہ مُکرنے والا

شام ہونے کو ہے اور آنکھ میں اِک خواب نہیں
کوئی اس گھر میں نہیں روشنی کرنے والا

دسترس میں ہیں عناصر کے ارادے کس کے
سو بکھر کے ہی رہا کوئی بکھرنے والا

اسی اُمید پہ ہر شام بجھائے ہیں چراغ
ایک تارا ہے سرِ بام اُبھرنے والا

موتی ہار پروئے ہُوئے
دن گزرے ہیں روئے ہُوئے

نیند مسافر کو ہی نہیں
رستے بھی ہیں سوئے ہُوئے

جشنِ بہار میں آ پہنچے
زخم کا چہرہ دھوئے ہُوئے

کبھی نہ کشتِ جاں اُجڑی
خواب تھے ایسے بوئے ہُوئے

اس کو پا کر رہتے ہیں
اپنے آپ میں کھوئے ہُوئے

آج بھی یونہی رکھے رہے
سارے ہار پروئے ہُوئے

کتنی برساتیں گزریں
اُس سے مل کر روئے ہُوئے

ایک وکٹورین شخص سے

بجائے اس کے
کہ تم مجھے سینت سینت کر
اپنے دل میں رکھو
اور الزبتھ دوم کے زمانے میں
عہدِ وکٹوریا کے آداب سیکھنے میں
اسی طرح زندگی گنوا دو،
اور ایک فقرے کی گفتگو کے لئے
یہاں سے وہاں تلک کا ادب کھنگالو

بہار کے پہلے دن کا ہر سال،
میری کھڑکی کے نیچے تنہا کھڑے ہُوئے
انتظار کھینچو

بس ایک دن،
دفعتاً
کہیں سے نکل کے آجاؤ
اور مجھے
بازوؤں میں اپنے سمیٹ کر
ایڑیوں پہ تم اپنی گھوم جاؤ !

میں تیتری رہنے میں خوش ہوں

عمر کی نصف شب —
کلبۂ جاں کے گونگے کواڑوں پہ یہ
کوئی دستک ہوئی
یا کہ مَیں نیند میں ڈر گئی
سوچتی ہوں
یہ کیسی محبّت ہوئی
جس کی بنیاد میں خوف کے اتنے پتّھر رکھے ہیں
کہ لگنے سے پہلے
عمارت کے سارے دریچوں کے شیشے لرزنے لگے ہیں

ایسا لگتا ہے، یہ خوف
باہر سے بڑھ کے کہیں میرے باطن میں ہے
اُس کی ذہنی وجاہت کی دہشت
اُس کی خوش روئی کی سانس کو روکنے والی ہیبت
پیچھا کرتی ہوئی آنکھ سے میری بے پردہ وحشت
تو باطن کے ڈر کا لبادہ ہیں

دراصل میں
اُس کو تسلیم کر کے
عمر بھر کی کمائی
اس آزادیٔ ذہن وجاں کو
گنوانا نہیں چاہتی
اور مجھے یہ خبر ہے
کہ میں اک دفعہ
ہاتھ اُس کے اگر لگ گئی تو
وہ مکھی بنا کے مجھے

اپنی دیوارِ خواہش سے تا عمر اس طرح چپکائے رکھے رہے گا
کہ میں
روشنی اور ہوا اور خوشبو کا
ہر ذائقہ اس طرح بُھول جاؤں گی
جیسے کبھی ان سے واقف نہ تھی
سو میں تیتری رہنے میں ہی بہت خوش ہوں
گرچہ یہاں
رزق اور جاں کی سازشیں بے پنہ ہیں
مگر
میرے پَر تو سلامت رہیں گے !

چین ری ایکشن[1]

مجھے تم اچھے لگتے ہو
تمہاری گفتگو میں
بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کو سمجھنے والے ذہن کی چمک ہے
اور تمہارے لمس میں
وہ گرم تازگی
جو بدن کے سارے موسموں کو سبز رکھتی ہے
تمہارے بازوؤں پہ سر رکھے

[1] CHAIN REACTION

میں ذہن اور جسم کا وصال دیکھتی ہوں
(فی زمانہ کس قدر عجیب واقعہ ہے یہ!)
مگر تمہارے اور میرے درمیاں
زمانوں اور عمروں
اور اپنے اپنے طبقے کے مفاد کا جو بُعد ہے
اُسے پھلانگنا
نہ میرے بس میں ہے
نہ تم میں اس کا حوصلہ!
مفاہمت کی گول میز پر
کبھی شمال اور جنوب کے مذاکرات کی طرح
ہماری سب دلیلیں
ایک دوسرے پہ شک کریں گی
اور کبھی جنوب اور جنوب کی غلام بحثِ خام کی طرح سے
ایک دوسرے کے خبثِ باطنی کا نیل پرنٹ
ڈھونڈتے رہیں گے ہم!

سو عافیت اسی میں ہے

کہ ہم اندھیرے میں رہیں

اور اپنے اپنے نیوٹرونز سے

تعلقات ٹھیک رکھیں

تمہارے اور میرے آئسوٹوپس

تابکار نفرتوں کی زد میں ایک بار آگئے

تو پھر محبتوں کا اختیار ختم سمجھو !

مجبوری کی ایک بات

ہاں اب تم بھی
اپنے سارے وعدوں
اور ٹھنڈک پہنچانے والی باتوں کے ہمراہ
مجھے پیاسا ہی رکھو گے
یہ جذبے میں بھیگی ہوئی آواز
مرے ماتھے کو جتنی بار چھوئے گی
اس کی تپش بڑھ جائے گی
آہستہ آہستہ

میرے تن پر بہنے اور پھسلنے والی

یہ بارش

یہ آگ

جس کی ٹھنڈک

جس کی حدت

اب بھی تمہاری پوروں میں ہے

میرے شانوں پر سر رکھے

تم جو یوں آنکھیں موندے کچھ سوچتے ہو

اس لمحے اس چہرے پر

کیسی سیرابی۔ کیا آسودگی تیر رہی ہے

میں نادم ہوں

یہ کیفیت

تمہیں مرے لہجے اور میرے چہرے میں

کبھی نظر نہیں آئی

جان!
تمہیں شاید نہ خبر ہو
بعض محبتیں
اپنے بلڈ گروپ میں
"او منفی" ہوتی ہیں!

الوداعیہ

وہ جا چکا ہے
مگر جُدائی سے قبل کا
ایک نرم لمحہ
ٹھہر گیا ہے
مری ہتھیلی کی پشت پر
زندگی میں
پہلی کا چاند بن کر!

دشت و دریا سے گزرنا ہو کہ گھر میں رہنا
اب تو ہر حال میں ہے ہم کو سفر میں رہنا

دل کو ہر پل کسی جادو کے اثر میں رہنا
خود سے نکلے تو کسی اور کے ڈر میں رہنا

شہرِ غم! دیکھ، تری آب و ہوا خشک نہ ہو
راس آتا ہے اُسے دیدۂ تر میں رہنا

فیصلے سارے اُسی کے ہیں ہماری بابت
اختیار اپنا بس اتنا کہ خبر میں رہنا

کوئی خاطر نہ مدارات نہ تقریبِ وصال
ہم تو بس چاہتے ہیں تیری نظر میں رہنا

رات بھر چاند میں دیکھا کروں صورت اُسکی
صبح کو اور ہی سودا مرے سر میں رہنا

میں تو ہر چہرے میں اب تک وہی چہرہ دیکھوں
اُس کو ہر روز تماشائے دگر میں رہنا

وہی تنہائی، وہی دھوپ، وہی بے سمتی
گھر میں رہنا بھی ہُوا، راہگزر میں رہنا

ٹوٹنا یُوں تو مقدر ہے۔ مگر کچھ لمحے
پھول کی طرح میسّر ہو شجر میں رہنا

ہر ملاقات کے بعد اجنبیت اور بڑھی
اُس کو آئینے ہمیں زعمِ ہنر میں رہنا

گھاس کی طرح جہاں بھوک اُگا کرتی ہو
اِتنا آسان نہیں شاخِ ثمر میں رہنا

چاند کی آخری راتوں میں بہت لازم ہے
ایک مٹی کا دیا راہگزر میں رہنا

طائرِ جاں کے گزرنے سے بڑا سانحہ ہے
شوقِ پرواز کا ٹوٹے ہُوئے پَر میں رہنا

کوئی سیفو ہو کہ میرا ہو کہ پروین، اُسے
راس آتا ہی نہیں چاند نگر میں رہنا

دو گھڑی میسّر ہو اس کا ہم سفر ہونا
پھر ہمیں گوارا ہے اپنا در بدر ہونا

اِک عذابِ پیہم ہے ایسے دورِ وحشت میں
زندگی کے چہرے پر اپنا چشمِ تر ہونا

اب تو اُس کے چہرے ہیں بے پناہ چہرے ہیں
کیا عجیب نعمت تھی ورنہ بے خبر ہونا

ہر نگاہ کا پتھر اور میرے بام و در
شہرِ بے فصیلاں میں کیا ستم ہے گھر ہونا

سوچ کے پرندوں کو اِک پناہ دینا ہے
دھوپ کی حکومت میں ذہن کا شجر ہونا

اُس کے وصل کی ساعت ہم پہ آئے تو جانا
کس گھڑی کو کہتے ہیں خواب میں بسر ہونا

میں ہجر کے عذاب سے انجان بھی نہ تھی
پر کیا ہُوا کہ صبح تلک جان بھی نہ تھی

گھر آنے میں مرے نہ تجھے جتنی جھجک رہی
اس درجہ تو میں بے سرو سامان بھی نہ تھی

اِتنا سمجھ چکی تھی میں اس کے مزاج کو
وہ جا رہا تھا اور میں حیران بھی نہ تھی

آراستہ تو خیر نہ تھی زندگی کبھی
پر تجھ سے قبل اتنی پریشان بھی نہ تھی

جس جا مکین بننے کے دیکھے تھے میں نے خواب
اُس گھر میں ایک شام کی مہمان بھی نہ تھی

دُنیا کو دیکھتی رہی جس کی نظر سے میں
اُس آنکھ میں مرے لئے پہچان بھی نہ تھی

روتی رہی اگر تو میں مجبور تھی بہت
وہ رات کاٹنی کوئی آسان بھی نہ تھی

نقدِ وفا کو چشمِ خریدار کیا ملے
اس جنس کے لئے کوئی دُکان بھی نہ تھی

آواز کے ہمراہ سراپا بھی تو دیکھوں
اے جانِ سخن! میں ترا چہرا بھی تو دیکھوں

دستک تو کچھ ایسی ہے کہ دل چھونے لگی ہے
اس حبس میں بارش کا یہ جھونکا بھی تو دیکھوں

صحرا کی طرح رہتے ہوئے تھک گئیں آنکھیں
دُکھ کہتا ہے، اب میں کوئی دریا بھی تو دیکھوں

یہ کیا کہ وہ جب چاہے مجھے چھین لے مجھ سے
اپنے لئے وہ شخص تڑپتا بھی تو دیکھوں

اب تک تو مرے شعر حوالہ رہے تیرا
میں اب تری رسوائی کا چرچا بھی تو دیکھوں

اب تک جو سراب آئے تھے انجانے میں آئے
پہچانے ہُوئے رستوں کا دھوکا بھی تو دیکھوں

اِک شخص کو سوچتی رہی مَیں
پھر آئینہ دیکھنے لگی مَیں

اُس کی طرح اپنا نام لے کر
خود کو بھی لگی نئی نئی مَیں

تُو میرے بِنا نہ رہ سکا تو
کب تیرے بغیر جی سکی مَیں

آتی رہے اب کہیں سے آواز
اب تو ترے پاس آ گئی مَیں

دامن تھا ترا کہ میرا ماتھا
جو داغ بھی تھے مٹا چکی مَیں

دائرہ

کسی نے زندگی اور موت کی سرحد کا نقشہ
وقت کے ہاتھوں سے چھینا ہے
کہاں آبادیاں معدوم ہوتی ہیں
کہاں ویرانیاں یک لخت اُگ آتی ہیں
کس کے علم میں ہوگا
وبا کے خوف سے جب شہرِ مینورنگ کے باشندگانِ اولیں
اور آخری گھر کے مکیں تک
بھاگ جائیں
تو بے آواز، بے مہکار اور بے لمس گھر
کچھ مر نہیں جاتے

کہیں سے کوئی مکڑی جھانکتی ہے

پھر در و دیوار اپنی ریشمیں تنہائی سے

آباد کرتی ہے

کہیں سے کوئی جھینگر، کوئی مکھی آن پھنستی ہے

بالآخر عنکبوتی کارہستی چل نکلتا ہے

اداسی میں سیاہی رچنے لگتی ہے

تو قرب و دُور سے

چمگادڑیں آتی ہیں

اور گرتی چھتوں کو تھام لیتی ہیں

کبوتر منہ میں دابے کوئی بلی

اور اُس کو سونگھتا کتا

کوئی سہما ہُوا خرگوش

اور خرگوش کے پیچھے لپکتا بھیڑیا

اور بھیڑیے کی پُشت پر ایک شیر

اور پھر شیر کے پیچھے کوئی پیاسا شکاری

رائفل کی نال اور کھڑکی کے جالے صاف کرتے کرتے
آنے والی آخری راتوں کی خاطر
موم بتی چھوڑ جاتا ہے

یہ مدھم روشنی
اگلے مسافر کے سفر تک

اور پھر
اگلے مسافر کے ٹھہر جانے' چلے جانے تک
آباد رہتی ہے
یہاں تک کہ
کہیں سے کوئی مکڑی جھانکتی ہے ... ...
... ...

دی مِسنگ لِنک[1]

عجب ہے، ارتقا کے باب کا یہ ذہن انگن مسئلہ
سارے عناصر
اپنی پہلے سے تعین کردہ ہیئت میں
کہیں سے جمع ہوتے ہیں
پھر اُس کے بعد، بے حد خامشی سے
واپسی کے طے شدہ رستوں پہ اِک دن چل نکلتے ہیں
ازل سے زندگی کا دائرہ
یونہی سفر میں ہے

[1] THE MISSING LINK

عناصر کا تناسب اپنے منظر کے تناظر میں بدلتا ہے
تلاشِ رزق میں گردن فصیلِ جسم سے باہر نکل جائے
کبھی سارا ہنر پنجوں میں در آئے
کبھی تلوے ہی جھڑ جائیں
کچھاریں اور بھٹ اور غار اور اسکائی سکریپر
زمیں پر پھیلتے جائیں
کبھی آہستہ آہستہ
کبھی یک لخت
اور گاہے بہ گاہے
دونوں صورت میں
(ابھی دانشوروں میں یہ سخن کچھ اختلافی ہے)
ثمرِ شجرۂ تعیں مطلوب ہے
جس ذی حشم، ذی شاں قبیلے کا
وہاں آ کر نسب نامہ

گھنے بالوں، مناسب شکل و صورت، قد و قامت تک
پہنچ کر گنگ ہو جاتا ہے
اُس کے بعد پھر بس ایک منزل
ایک لمحہ
ایک صدی
آنکھوں سے اوجھل ہے!

حقیقت یہ ہے لیکن
اگر تھوڑی سی سچّائی نظریں کھول کر
اِک دن ذرا سا اپنے گرد و پیش کو
ہم دیکھ ڈالیں
تو یہ گم گشتہ حلقہ ایسے روشن ہو
کہ سب کھوئی ہوئی کڑیاں
ہمارے ہاتھ آجائیں!

اگر تھوڑی سی جرأت

اور تنہائی میں آئینہ اُٹھا کر دیکھنے کا حوصلہ بھی ہو

تو شاید

اتنی زحمت بھی نہیں کرنی پڑے ہم کو !

پھُولوں کا کیا ہو گا ؟ ....

سُنا ہے
تتلیوں پر پھر کوئی حد جاری ہوتی ہے
اگر گُل قند خود ہی شہد کی سب مکھیوں کے گھر پہنچ جائے
تو اُن کو گُل بہ گُل آوارہ گردی کی ہے حاجت کیا
ہوا کی چال بھی کچھ نامناسب ہوتی جاتی تھی
سو تتلی اور مکھی اور ہوا
نامحرموں سے دُور رکھی جا رہی ہیں
مگر یہ بھی کوئی سوچے
کہ پھر پھولوں کا کیا ہو گا
چمن میں ایسے کتنے پھول ہوں گے
کہ جو خود وصل اور خود بار آور ہوں !

سفر کی خواہش کسے نہیں ہے

سفر کی خواہش کسے نہیں ہے
کوئی پرندوں کی طرح اُڑنے کا آرزومند ہے
کوئی ڈاک کے لفافے کی طرح محتاط، پا بہ منزل
کسی کی پرواز تا افق
اور کسی کی مکتوب الیہ تک ہے
یہ اپنے اپنے ارادے اور توشۂ سفر پر بھی منحصر ہے!

پرندوں اور جگنوؤں کے اور تتلیوں کے ہمراہ
بھاگنا

بھاگتے ہی رہنا

عجیب رومان تو ہے لیکن

سفر کی لذّت کو اپنی پوروں میں

شہد بن کر اُترتے تب دیکھ پائیں گے ہم

کہ جب کہیں پر قیام بھی ہو

اور اس خبر کے لئے

ہوا کی مزاحمت کا

بدن کو ممنون ہونا ہوگا!

ہمارا المیہ یہ ہے

ہمارا المیہ یہ ہے
کہ ہم انکار کے رُومان ہیں
کچھ اس طرح سے مبتلا ہیں
کہ ہر موجود کو
اب صرف ناموجود کہتے ہیں ہی خوش ہوں گے
بزعمِ خود
کبھی سقراط بن کر
اور کبھی منصورؔ کے الفاظ

بصری کھیل کی صورت میں
سادہ لوح انسانوں کے آگے
پیش کرتے ہیں
کوئی بھی خود کو ہرگز
والتیئر اور یار روسو سے تو کم گنتا نہیں ہے !

معافی مانگ کر
ہر شب امیرِ شہر سے
ہر صبح
گرفتاری کے حیلے ڈھونڈنا بھی
اپنا خاصا ہے
کبھی سرمایہ داروں
پہلی یا پھر دوسری دنیا کے رجعت گر
سفارت خانوں اور مکردہ بیورو کریٹس کے گھر میں
شرابیں پی کر

خود کو تیسری دنیا کا تیکھا انقلابی نشر کرتے ہیں

مثالِ سگ گزیدہ

اب کبھی آبِ رواں کا دیکھنا ممکن نہیں اپنا
کوئی ہم کو دکھائے بھی تو کیسے
پُلوں سے کتنا پانی بہہ چکا ہے!

عشق میں بھی مرنا اتنا آسان نہیں
ذات کو رد کرنا اتنا آسان نہیں

مجھ میں ایسی ہی خامی دیکھی اس نے
ترکِ وفا ورنہ اتنا آسان نہیں

ایک دفعہ تو پاسِ مسیحا کر جائے
زخم کا پھر بھرنا اتنا آسان نہیں

جانے کب شہرت کا زینہ ڈھ جائے
پاؤں یہاں دھرنا اتنا آسان نہیں

مرنے کی دہشت تو سب نے دیکھی ہے
جینے سے ڈرنا اتنا آسان نہیں

جو دھوپ میں رہا نہ روانہ سفر پہ تھا
اُس کے لیے عذاب کوئی اور گھر پہ تھا

چکّر لگا رہے تھے پرندے شجر کے گرد
بچّے تھے آشیانوں میں، طوفان سر پہ تھا

جس گھر کے بیٹھ جانے کا دُکھ ہے بہت ہمیں
تاریخ کہہ رہی ہے کہ وہ بھی کھنڈر پہ تھا

ہم یاد تو نہ آئیں گے لیکن بچھڑتے وقت
تارہ سا اک خیال تری چشمِ تر پہ تھا

سب زخم کھل اُٹھے تو سبک رنگ ہوں بہت
باقی یہ قرضِ ناخنِ دستِ ہنر پہ تھا

یہ کیا کیا کہ گھر کی محبت میں پڑ گئے
آوارگانِ شب کا تو ہونا سفر پہ تھا

دشمن کو ہارنے سے بچانا عجیب تھا
ترکِ مدافعت کا بہانا عجیب تھا

اک دوسرے کو جان نہ پائے تمام عمر
ہم ہی عجیب تھے کہ زمانہ عجیب تھا

زندہ بچا نہ قتل ہُوا طائرِ اُمید
اُس تیرِ نیم کش کا نشانہ عجیب تھا

سُنتے رہے اخیر تلک مہر و ماہ و نجم
اس خاکداں کا سارا فسانہ عجیب تھا

جس راہ سے کبھی نہیں ممکن ترا گزر
تیرے طلب گروں کا ٹھکانہ عجیب تھا

اب کے تو یہ ہُوا ہے کہ میرے بُلانے سے
اس زود رنج شخص کا آنا عجیب تھا

کھونا تو خیر تھا ہی کسی دن اُسے مگر
ایسے ہوا مزاج کا پانا عجیب تھا

سب داغ بارشوں کی ہُوا میں بُجھے رہے
بس دل کا ایک زخم پرانا عجیب تھا

یہ کیسا اذنِ تکلم ہے جس کی تاب نہ ہو
سوال کرنے دیا جائے اور جواب نہ ہو

اگر خلوص کی دولت کے گوشوارے بنیں
تو شہر بھر میں کوئی صاحبِ نصاب نہ ہو

ہرا ہے زخمِ تمنا تو اشک کیسے تھمیں
بہار میلے میں کیوں شرکتِ گلاب نہ ہو

ہمیں تو چشمۂ حیواں بھی کوئی دکھلائے
تو تجربہ یہ کہے گا۔ کہیں سراب نہ ہو

ہماری بے جہتی کا کوئی جواز نہیں
یہ دُکھ تو اُن کا ہے جن کی کوئی کتاب نہ ہو

زمین اپنی محبّت میں بے غرض تو نہیں
یہ اور بات کہ ہر ہاتھ کا حساب نہ ہو

ایک ایسی تتلی کہ بچے کے لمس سے محروم
وہ نیند جس کے تعاقب میں کوئی خواب نہ ہو

ہے مسئلہ مرے سورج مُکھی قبیلے کا
کہ صبح نکلے مگر ساتھ آفتاب نہ ہو

چراغ طاقِ تمنّا میں رکھ کے بھول گئی
دُعا وہ مانگ رہی تھی جو مستجاب نہ ہو

کبھی نہ تنگ ہو اُس پر زمین کا دامن
امیرِ شہر اگر آسماں جناب نہ ہو

ہمارے قحط بھی اور بارشیں بھی پوری ہوئیں
ہمارے نام کا اب تو کوئی عذاب نہ ہو

سکوت خلق سمندر کی نیند ہوتا ہے
سکوں نہ جان بظاہر جو اضطراب نہ ہو

یہ چشم نم ہے اسے خشک دیکھ بھال کے کر
بھری بھری کوئی بستی بھی زیر آب نہ ہو

بس ایک نام کا تارا سدا چمکتا رہے
گلہ نہیں جو مقدر میں ماہتاب نہ ہو

چراغ مانگتے رہنے کا کچھ سبب بھی نہیں
اندھیرا کیسے بتائیں کہ اب تو شب بھی نہیں

میں اپنے زعم میں اِک بازیافت پر خوش ہوں
یہ واقعہ ہے کہ مجھ کو ملا وہ اب بھی نہیں

جو میرے شعر میں مجھ سے زیادہ بولتا ہے
میں اُس کی بزم میں اِک حرفِ زیرِ لب بھی نہیں

اور اب تو زندگی کرنے کے سو طریقے ہیں
ہم اس کے ہجر میں تنہا رہے تھے جب بھی نہیں

کمال شخص تھا جس نے مجھے تباہ کیا
خلاف اُس کے یہ دل ہو سکا ہے اب بھی نہیں

یہ دستکیں، یہ مری زندگی کی آدھی رات
ہوا کا شور سمجھ لوں تو کچھ عجب بھی نہیں

یہ دُکھ نہیں کہ اندھیروں سے صلح کی ہم نے
ملال یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

حسابِ دربدری تجھ سے مانگ سکتا ہے
غریبِ شہر مگر اتنا بے ادب بھی نہیں

ہمیں بہت ہے، یہ سادات عشق کی نسبت
کہ یہ قبیلہ کوئی ایسا کم نسب بھی نہیں

نوشتہ

..... تب زینب نے بکر کو گالی دیتے ہوئے کہا :
کہ اس (بکر) کی ماں اس کے باپ سے زیادہ مشہور تھی

مرے بچے !
ترے حصے میں بھی یہ تیر آئے گا
تجھے بھی اس پدر بنیاد دُنیا میں ، بالآخر
اپنے یوں مادر نشاں ہونے کی اِک دن
بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی

اگرچہ

تیری ان آنکھوں کی رنگت

تیرے ماتھے کی بناوٹ

اور ترے ہونٹوں کے سارے زاویے

اُس شخص کے ہیں

جو تری تخلیق میں ساجھی ہے میرا

فقیہِ شہر کے نزدیک جو پہچان ہے تیری

مگر جس کے لہو نے تین موسم تک تجھے سینچا ہے

اُس تنہا شجر کا

ایک اپنا بھی تو موسم ہے

لہو سے فصل تارے چھاننے کی

سوچ سے خوشبو بنانے کی رُتیں

اور شعر کہنے کا عمل

جن کی عملداری ترے اجداد کے قلعوں سے باہر جا چکی ہے

اور جسے واپس بلا سکنا

نہ سیفو کے لیے ممکن رہا تھا
نہ میرا کے ہی بس میں تھا!

سو اب ، ہمجولیوں میں
گاہے گاہے تیری خجلت
واقفوں کے آگے تیرے باپ کی مجبور خفت
اس گھرانے کا مقدر ہو چکی ہے
کوئی تختی لگی ہو صدر دروازے پہ لیکن
حوالہ ایک ہی ہوگا
ترے ہونے نہ ہونے کا!

فَبِأَیِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰن

(اور اپنے رب کی تم کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

دلآزاری بھی اک فن ہے
اور کچھ لوگ تو
ساری زندگی اسی کی روٹی کھاتے ہیں
چاہے اُن کا بُرج کوئی ہو
عقرب ہی لگتے ہیں
تیسرے درجے کے پیلے اخباروں پر یہ
اپنی یرقانی سوچوں سے
اور بھی زردی مَلتے رہتے ہیں

مالا باری کیبن ہوں یا پانچ ستارہ ہوٹل
کہیں بھی قے کرنے سے باز نہیں آتے
اوپر سے اس عمل کو
فقرے بازی کہتے ہیں
جس کا پہلا نشانہ عموماً
بل کو ادا کرنے والا ساتھی ہوتا ہے !

اپنے اپنے کنوئیں کو بحرِ اعظم کہنے اور سمجھنے والے
یہ ننھے مینڈک
ہر ہاتھی کو دیکھ کے پھُولنے لگتے ہیں
اور جب پھٹنے والے ہوں تو
ہاتھی کی آنکھوں پر پھبتی کسنے لگتے ہیں

کوّے بھی انڈے کھانے کے شوق کو اپنے
فاختہ کے گھر جا کر پُورا کرتے ہیں

لیکن یہ وہ سانپ ہیں جو کہ
اپنے بچّے
خود ہی چٹ کر جاتے ہیں

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ
سانپوں کی یہ خصلت
مالکِ جنّ و انس کی، انسانوں کے حق میں
کیسی بے پایاں رحمت ہے!

فروغ فرّخ زاد کے لئے ایک نظم

مصاحبِ شاہ سے کہو کہ
فقیہہِ اعظم بھی آج تصدیق کر گئے ہیں
کہ فصل پھر سے گناہ گاروں کی پک گئی ہے
حضور کی جنبشِ نظر کے
تمام جلّاد منتظر ہیں
کہ کون سی حد جناب جاریِ کریں

تو تعمیلِ بندگی ہو ــــ

کہاں پہ سَر اور کہاں پہ دستار اتارنا احسن العمل ہے

کہاں پہ ہاتھوں، کہاں زبانوں کو قطع کیجئے

کہاں پہ دروازہ رزق کا بند کرنا ہوگا

کہاں پہ آسائشوں کی بھوکوں کو مار دیجے

کہاں بٹے گی لعان کی چھوٹ

اور کہاں پر

رجم کے احکام جاری ہوں گے

کہاں پہ نو سالہ بچیاں، پچاس سالہ مردوں کے ساتھ

سنگین میں پڑنے کا حکم ہوگا

کہاں پہ اقبالی ملزموں کو

کسی طرح شک کا فائدہ ہو

کہاں پہ معصوم دار پر کھینچنا پڑے گا

حضور احکام جو بھی جاری کریں

فقط التجا یہ ہو گی

کہ اپنے ارشادِ عالیہ کو
زبانی رکھیں
وگرنہ
قانونی اُلجھنیں ہیں!

پاسبانی پہ اندھیرے کو تو گھر پر رکھا
اور چراغوں کو تری راہگزر پر رکھا

رہ گیا ہاتھ سدا تیغ و سپر پر رکھا
ہم نے ہر رات کا انجام سحر پر رکھا

ہاتھ اُٹھائے رہے ہر لمحہ دعا کی خاطر
اور الفاظ کو تنسیخِ اثر پر رکھا

بے وفائی مری فطرت کے عناصر میں تو تھی
تیری بے مہری کو اسباب دگر پر رکھا

اتنا آسان نہ تھا ورنہ اکیلے چلنا
تجھ سے ملتے رہے اور دھیان سفر پر رکھا

اُس کی خوشبو کا ہی فیضان ہیں اشعار اپنے
نام جس زخم کا ہم نے گلِ تر پر رکھا

پانی دیکھا، نہ زمیں دیکھی، نہ موسم دیکھا
بے ثمر ہونے کا الزام شجر پر رکھا

(منیر نیازی کی زمین میں)

میں فقط چلتی رہی منزل کو سر اُس نے کیا
ساتھ میرے روشنی بن کر سفر اُس نے کیا

اس طرح کھینچی ہے میرے گرد دیوار خبر
سارے دشمن روزنوں کو بے نظر اُس نے کیا

مجھ میں بستے سارے سناٹوں کی لے اس سے بنی
پتھروں کے درمیاں تھی نغمہ گر اُس نے کیا

بے سر و ساماں پہ دلداری کی چادر ڈال دی
بے در و دیوار تھی میں مجھ کو گھر اُس نے کیا

پانیوں میں یہ بھی پانی ایک دن تحلیل تھا
قطرۂ بے صرفہ کو لیکن گہر اُس نے کیا

ایک معمولی سی اچھائی تراشی ہے بہت
اور فکرِ خام سے صرفِ نظر اُس نے کیا

پھر تو امکانات پھولوں کی طرح کھلتے گئے
ایک ننھے سے شگوفے کو شجر اُس نے کیا

طاق میں رکھے دیے کو پیار سے روشن کیا
اِس دیے کو پھر چراغِ رہگزر اُس نے کیا

پھیلا دیے خود ہاتھ طلب گار کے آگے
دیکھا نہیں کچھ ہم نے خریدار کے آگے

پھر شام ہوئی اور بڑھا ناخن اُمید
پھر صبح ہے اور ہم اُسی دیوار کے آگے

شہزادے! مری نیند کو تو کاٹ چکا ہے
ٹھہرا نہ یہ جنگل تری تلوار کے آگے

کیا جاں کے خسارے کی تمنا ہو کہ اب عشق
بڑھتا ہی نہیں درہم و دینار کے آگے

وہ ایڑ لگی رخش زمانہ کو کہ اب تو
اسوار سراسیمہ ہے رہوار کے آگے

پھر روزۂ مریم جو فقیہوں میں ہے مقبول
عاجز تھے بہت وہ مری گفتار کے آگے

انکار کی لذت میں جو سرشار رہے ہیں
کب ٹوٹ سکے ہیں رسن و دار کے آگے

یا قوس رکھے یا وہ ہمیں دائرہ کر دے
نقطے کی طرح ہیں کسی پرکار کے آگے

جاں اپنی ہے اور آبرو نسلوں کی کمائی
سر کون بچاتا پھرے دستار کے آگے

گھمسان کا رن جیت کے لب بستہ کھڑی ہوں
میں پشت سے آئے ہوئے اک وار کے آگے

عجب مکاں ہے کہ جس میں مکیں نہیں آتا
حدودِ شہر میں کیا دل کہیں نہیں آتا

میں جس کے عشق میں گھر بار چھوڑ بیٹھی تھی
یہی وہ شخص ہے مجھ کو یقیں نہیں آتا

مزہ ہی شعر سنانے کا کچھ نہیں جب تک
قصیدہ گویوں میں وہ نکتہ چیں نہیں آتا

فشارِ جاں کے بہت ہیں اگر نظر آئیں
ہر ایک زلزلہ زیرِ زمیں نہیں آتا

بھرم ہے مہر و مہ و نجم کا بھی بس جب تک
مقابل اِن کے وہ روشن جبیں نہیں آتا

یوں چاہے خزاں کھڑی ہو دِل میں
اِک آس کی پنکھڑی ہو دِل میں

کیا ناخنِ مہر و مہ سے کُھلتی
جس شب کی گرہ پڑی ہو دِل میں

وہ سامنے ہو تو معرکہ اور
جنگ اُس سے الگ لڑی ہو دِل میں

اُس نام پہ مُسکرائے جانا
اشکوں کی مگر جھڑی ہو دِل میں

مصلوب نہیں مگر یہ احساس
اِک میخ ابھی گڑی ہو دِل میں

ایک مشورہ

زبردست

درونِ گفتگو
بامعنی وقفے آنے لگ جائیں
تو باقی گفتگو
بے معنی ہو جاتی ہے
سو اے خوش سخن میرے!
ہمیں اب خامشی پر دھیان دینا چاہیئے اپنی!

مجھے مت بتانا

مجھے مت بتانا
کہ تم نے مجھے چھوڑنے کا ارادہ کیا تھا
تو کیوں
اور کس وجہ سے
ابھی تو تمہارے بچھڑنے کا دُکھ بھی نہیں کم ہُوا
ابھی تو میں
باتوں کے وعدوں کے شہرِ طلسمات میں
آنکھ پر خوش گمانی کی پٹی لیے

تم کو پیڑوں کے پیچھے، درختوں کے جُھنڈ

اور دیوار کی پُشت پر ڈھونڈنے میں مگن ہوں

کہیں پر تمہاری صدا اور کہیں پر تمہاری مہک

مجھ پہ ہنسنے میں مصروف ہے

ابھی تک تمہاری ہنسی سے نبرد آزما ہوں

اور اس جنگ میں

میرا ہتھیار

اپنی وفا پر بھروسہ ہے اور کچھ نہیں

اسے کند کرنے کی کوشش نہ کرنا

مجھے مت بتانا.....

چہ کنم

بے بسی کے رستے پر
کیا عجب دوراہا ہے
ایک سمت بے سمتی
بے چراغ تاریکی
بے لباس ویرانی
بے لحاظ رسوائی
بے سواد قربانی
ہشت پایۂ تنہائی

اژدری پذیرائی
گرگ زادِ غم‌خواری
بے کنار روباہی
اور دُوسری جانب
قلعہ بند چاہت میں
دل کی آبروریزی!

بے یقینی کی ایک نظم

نہ کوئی عہد، نہ پیمان

نہ وعدہ ایسا

نہ ترا حسن ہی ایسا کوئی انگشت تراش

نہ مرے ہاتھ میں تاثیرِ زلیخائی ہے

رقص گہ ہے یہ جہاں اور نہ میں سنڈریلا ہوں

نہ تو شہزادہ ہے

ہم تو بس رزم گہِ ہستی میں

دو مبارز دل ہیں

اس تعلق کا کوئی رنگ اگر ہے تو حریفانہ ہے

ایک ہی تھال سے چننی ہے ہمیں نانِ جویں
ایک ہی سانپ کے منہ سے ہمیں من چھیننا ہے
اور اس کشمکشِ رزق میں موہوم کشائش کی کلید
جس قدر میری قناعت میں ہے
اتنی تیری فیاضی میں
میں تری چھاؤں میں پروان چڑھوں
اپنی آنکھوں پہ ترے ہاتھ کا سایہ کرکے
ترے ہمراہ میں سورج کی تمازت دیکھوں
اس سے آگے نہیں سوچا دل نے
پھر بھی احوال یہ ہے
اِک بھروسہ ہے کہ دل سبز کیئے رکھتا ہے
ایک دھڑکا ہے کہ خوں سرد کیئے رہتا ہے

گھر کے مٹنے کا غم تو ہوتا ہے
اپنے ملبے پہ کون سوتا ہے

خوشبوئے غیر تن سے آتی ہے
بازوؤں میں مجھے سموتا ہے

میرے دل! آنسوؤں سے ہاتھ اُٹھا
کیسی بارش سے زخم دھوتا ہے

شام ہوتے ہی میری پلکوں پر
کون یہ ہار سا پروتا ہے

رات کے بیکراں اندھیرے میں
کوئی جگنو کی نیند سوتا ہے

عمر کا بھروسہ کیا، پل کا ساتھ ہو جائے
ایک بار اکیلے میں اس سے بات ہو جائے

دل کی گنگ سرشاری اس کو جیت لے لیکن
عرض حال کرنے میں احتیاط ہو جائے

ایسا کیوں کہ جانے سے صرف ایک انساں کے
ساری زندگانی ہی بے ثبات ہو جائے

یاد کرتا جائے دل اور کھلتا جائے دل
اوس کی طرح کوئی پات پات ہو جائے

سب چراغ گل کر کے اُس کا ہاتھ تھاما تھا
کیا قصُور اس کا، جو بَن میں رات ہو جائے

ایک بار کھیلے تو وہ مری طرح اور پھر
جیت لے وہ ہر بازی، مجھ کو مات ہو جائے

رات ہو پڑاؤ کی پھر بھی جاگیے ورنہ
آپ سوتے رہ جائیں اور ہات ہو جائے

خواب کیا دیکھے کوئی نیند کے انجام کے بعد
کس کو جینے کی ہوس حشر کے ہنگام کے بعد

عشق نے سیکھ ہی لی وقت کی تقسیم کہ اب
وہ مجھے یاد تو آتا ہے مگر کام کے بعد

ایک ہی اسم کو بارش نے ہرا رکھا ہے
پیڑ پہ نام تو لکھے گئے اُس نام کے بعد

ہنس سے گدھ کی طرح دن مرا کھا جاتے ہیں
حرف ملنے مجھے آتے ہیں ذرا شام کے بعد

موت وہ ساقی کہ جس کے کبھی تھکتے نہیں ہاتھ
بھرتی جائے گی سدا جام وہ اک جام کے بعد

تھک کے میں بیٹھ گئی اب مگر اے سایہ طلب
کس کی خیمے پہ نظر جاتی تھی ہر گام کے بعد

دل کا کیا ہے وہ تو چاہے گا مسلسل ملنا
وہ ستم گر بھی مگر سوچے کسی پل ملنا

واں نہیں وقت تو ہم بھی ہیں عدیم الفرصت
اُس سے کیا ملیے جو ہر روز کہے "کل ملنا"

عشق کی رہ کے مسافر کا مقدّر معلوم
شہر کی سوچ میں ہو اور اُسے جنگل ملنا

اُس کا ملنا ہے عجب طرح کا ملنا جیسے
دشتِ اُمید میں اندیشے کا بادل ملنا

دامنِ شب کو اگر چاک بھی کر لیں تو کہاں
نور میں ڈوبا ہُوا صبح کا آنچل ملنا

لفظ بڑھے اور وعدے پھیلے دل کی حکایت ختم ہوئی
وہاں ہوس کا پرچم لہرایا جہاں محبت ختم ہوئی

وہ بھی نہیں کہتا ملنے کو ہمیں بھی کچھ اصرار نہیں
سر سے سودا اُتر گیا اور دل سے چاہت ختم ہوئی

جتنی کم سچائی ہوگی اتنی ہوگی آرائش
جب مضمون سے لفظ ہوں زاید سمجھو عبارت ختم ہوئی

جب تک سجدہ اُس کے نام پہ اُس کے حضور ہے تب تک ہے
کام خدا سے کیا یاد آیا ساری عبادت ختم ہوئی

دل کے غزال کو سارا رَم صحرا کی وسعت دیتی ہے
شہرِ رزق میں آنکلا اور ساری وحشت ختم ہوئی

بھٹ

بھیڑیے کے آنے سے
ایک دو گھڑی پہلے
ایک سنسناتی بُو
بَن میں پھیل جاتی ہے

آج میرے گھر میں بھی
میری تیسری حس نے
کوئی بات دیکھی ہے

اِتنی دیر میں، مَیں نے
تیسری کہ چوتھی بار
گھر کے کونے کونے میں
پھر گلاب چھڑکا ہے

پھر گلاب کی ڈھالیں
کیا مجھے بچا لیں گی؟

انہونی کی ایک دُعا

چاندی کا یہ تار
میرے سیہ بالوں میں
گھڑی گھڑی بجلی کی طرح چمکتا ہے
سوتے جاگتے میں اس لشکارے کی زد میں رہتی ہوں!
ایک لمحہ تو جیسے دل ہی ٹھہر گیا تھا!
آئینہ
عمر میں پہلی دفعہ
سچ بولتا نہیں لگا تھا
شک کا فائدہ بینائی کو دیا تھا میں نے
لیکن کتنے عرصے؟

(فیصلہ کتنا ٹلتا !)

کتنے آئینے چُپ رہتے
اور کتنی آنکھیں میرا دل رکھ سکتی تھیں
جان گئی ہوں
وقت
مری برنائی پر
پہلا شب خوں ڈال چکا ہے !

کیسے کیسے چہرے نظر میں گھوم رہے ہیں
فرطِ محبّت سے گلنار
جوشِ عقیدت سے سرشار
مجھ کو دیکھنے، مجھ کو چھُونے، مجھ کو پانے کی حسرت میں
کوچہ بہ کوچہ خوار
سرتاپا دلدار

آج ہمہ تن چشم وہ لوگ
مجھ کو کیسے دیکھیں گے
دیکھ سکیں گے ؟
مالک! اس انبوہِ طلب میں
کیا کوئی ایسی آنکھ بھی ہو گی
جس کی چمک
بجھ جانے کی بجائے
چاندی کے اس تار کو چھو کر
سونے جیسی ہو جائے ؟

اِک تنہا سیّارہ

میری پیشانی کو دیکھ کے
میری ماں نے میرا نام
اِک تارے کے نام پہ رکھا
جگمگ کرنے والا

لیکن میری کیمسٹری میں
ایسا کوئی طلسم نہیں ہے
جو میری تقدیر کو جھلمل کردے
میری مانگ میں اُس کے نام کی افشاں بھر دے!

میں اپنے سورج سے
ہزاروں نوری سال کے فاصلے پر ہوں
کائنات کی بے اندازہ وسعت میں
اِک تنہا سیارہ ہوں!

فرزندِ زمیں سے

اِک چوتھائی صدی سے زائد ساتھ کے بعد
جس گھر کی بنیادوں میں جذبے نے رکھا
میری ماں کا دوپٹہ - میرے باپ کی پگ
جس کی دیواروں میں میرے خواب تمام
چُونے اور گچ کی صُورت چُن دیے گئے
اُس گھر کی چھت کا مالک مجھ سے کہتا ہے
تُم ہم میں سے نہیں ہو !

میں اِس فردِ جرم کے آگے
سر کو جُھکائے کھڑی ہوئی ہوں
عرق آلود اور مُہر بہ لب
سوچ رہی ہوں
کیا پتا مَیں سے آنے والی تیکھی ہوا کی سرگوشی سچ ہے
میرے آقاؐ
جن پر میرے اور تمہارے آباؤ اجداد نثار
اُن کے اور یثرب کے بیچ
ایک صدا کا فاصلہ تھا
اس مٹّی کی خوشبو میں بسنے کے لئے
مجھ کو ہیں درکار
کتنے دن اور کتنے برس اور کتنی صدیاں بجائی ؟

دُنیا کو تو حالات سے اُمید بڑی تھی
پر چاہنے والوں کو جُدائی کی پڑی تھی

کس جانِ گُلستاں سے یہ ملنے کی گھڑی تھی
خوشبو میں نہائی ہُوئی اِک شام کھڑی تھی

میں اُس سے ملی تھی کہ خود اپنے سے ملی تھی
وہ جیسے مری ذات کی گُم گشتہ کڑی تھی

یُوں دیکھنا اُس کو کہ کوئی اور نہ دیکھے
انعام تو اچھا تھا مگر شرط کڑی تھی

کم مایہ تو ہم تھے مگر احساس نہیں تھا
آمد تری اس گھر کے مقدر سے بڑی تھی

میں ڈھال لیے سمت عدو دیکھ رہی تھی
پلٹی تو مری پُشت پہ تلوار گڑی تھی

چاند چہروں کے فروزاں تھے کہ ناموں کے گلاب
شاخِ مژگاں پہ مہکتے رہے یادوں کے گلاب

تیری زیبائی سلامت رہے اے قامتِ دوست!
زیبِ پوشاک رہیں گے مرے زخموں کے گلاب

جی اُٹھی خاک نمی پا کے مرے اشکوں کی
کِھل رہے ہیں مری گِل میں نئے خوابوں کے گلاب

اُس نے چُوما مری آنکھوں کو سحر دم اور پھر
رکھ گیا میرے سرہانے مرے خوابوں کے گلاب

کون چھو کر انہیں گزرا کہ کِھلے جاتے ہیں
اتنے سرشار تو پہلے نہ تھے ہونٹوں کے گلاب

دو پہر شام ہوئی۔ شام شبِ تار ہوئی
اور کِھلتے رہے، کِھلتے رہے باتوں کے گلاب

سرحدِ نُور پہ اس طرح سے خوشبو پہنچی
چاند پھولوں کے ہُوئے اور بنے تاروں کے گلاب

اِک صدا پُکارے جاتی ہے

گھنے گھنگھریالے بالوں والا شہزادہ
وارث شاہ کے دیس کا رہنے والا
اُونچا قد اور اُس سے اُونچا شملہ
روشن ماتھا اور اُس پر اقبال کا چاند
بھُوری آنکھیں اور اُن میں سچے موتی
ترشے ہوئے لب اور مہکتے میٹھے بول
کرڑیل ایسا
اپنی بائیں ہتھیلی پر وہ مجھے اُٹھالے
یوں چلتا ہے

جیسے زمین فقط اُس کے قدموں کے لیے بنی ہے

کم کم بولنے

اور زیادہ دیکھنے والا

میرے چاروں جانب

اپنے وجود کی دھنجلی بجائے جاتا ہے

اُس سے ہزاروں کوس کی دُوری پر بیٹھی ہوں

اور پھر بھی

اِک صدا پکارے جاتی ہے

میرے نام کو سانجھ سویرے

اِک تان بلانے جاتی ہے

مجھے پل پل تخت ہزارے!

ایک خط

بہت یاد آنے لگے ہو

بچھڑنا تو ملنے سے بڑھ کے

تمہیں میرے نزدیک لانے لگا ہے

میں ہر وقت خود کو

تمہارے جواں بازوؤں میں پگھلتے ہوئے دیکھتی ہوں

مرے ہونٹ اب تک

تمہاری محبت سے نم ہیں
تمہارا یہ کہنا غلط تو نہ تھا کہ
مرے لب تمہارے لبوں کے سبب سے ہی گلنار ہیں
تو خوش ہو
کہ اب تو مرے آئینے کا بھی کہنا یہی ہے
میں ہر بار بالوں میں کنگھی ادھوری ہی کر پا رہی ہوں
تمہاری محبت بھری اُنگلیاں روک لیتی ہیں مجھ کو
میں اب مانتی جا رہی ہوں
میرے اندر کی ساری رُتیں
اور باہر کے موسم
تمہارے سبب سے
تمہارے لئے تھے!

جواباً

خزاں مجھ میں چاہو گے تم دیکھنا

یا کہ فصلِ بہاراں

کوئی فیصلہ ہو

مگر جلد کر دو تو اچھا!

جُدائی کے بندی خانے میں...

بس اب تو جینے کا ایک ہی سلسلہ ہے جاناں!
تمہاری سوچوں میں ڈوبے رہنا
تمہارے خوابوں میں کھوئے رہنا
کسی طرح تم کو دیکھنے کی سبیل کرنا
تمہارے کوچے تک آنے کا کچھ بہانہ کرنا
ہر آتے جاتے سے خیریت کی نوید لینا
ہواؤں اور چاند اور پرندوں پہ رشک کرنا

مرا جو احوال پوچھتا ہے تو یہ ہے جاناں!

کہ جانے کب سے

جدائی کے بندی خانے میں بند

برف کی سِل پہ تنہا بیٹھی

حرارتِ زندگی سے کچھ رابطہ ڈھونڈتی ہوں

بدن کو اپنے

تمہارے ہاتھوں سے چھو رہی ہوں!

ابھی ہے

ایک سوال — دُور جا بسنے والوں سے

پھر وہی بسترِ سنجاف پہ کانٹوں کی بہار
پھر سے شب خوابی کے ملبوسِ حریری میں تنِ زار کی آگ
پھر تری یاد میں جلتے دل کو
کسی پہلو نہیں آتا ہے قرار
اے مرے خواب چراغ
تیرا پیراہنِ آبی بھی اسی طرح شرر بار ہے کیا
اور تری چشمِ سبک خواب سے بھی

نیند بیزار ہے کیا

یا ہمیشہ کی طرح

تیرے لئے رقصِ دلآرام ہے رات

نیند کے شانوں پہ سر رکھے ہوئے سوتا ہے

مے کے اور ساقیٔ محفل کے اثر سے، تیری

آنکھ میں ہلکے گلابی ڈورے

مسکراتا ہوا تنہائی پر

تو مری یاد غلط کرنے کو جا نکلا ہے ؟

کریں ترکِ زمیں یا جا بسیں یاں سے
وہی انداز اُن کے آسماں سے

اگر چاہیں تو وہ دیوار پڑھ لیں
ہمیں اب کچھ نہیں کہنا زباں سے

ستارہ ہی نہیں جب ساتھ دیتا
تو کشتی کام لے کیا بادباں سے

ضروری ہو گئی اب دل کی زینت
مکیں پہچانے جاتے ہیں مکاں سے

بساطِ زیست پر اکثر زمانہ
پلٹ لیتا ہے اپنے حق میں پانسے

دگرنہ فصلِ گُل کی قدر کیا تھی
بڑی حکمت ہے وابستہ خزاں سے

کسی نے بات کی تھی ہنس کے شاید
زمانے بھر سے ہیں ہم خوش گماں سے

کبھی تنہائی کا ڈر روکتا تھا
اور اب مشکل ہجومِ ہمرہاں سے

الاؤ ہی جلانے کی شبیں ہیں
مگر ہٹ کر کسی کے سائباں سے

سبھی سودے خسارے کے نہیں تھے
مگر فرصت نہ تھی کارِ جہاں سے

محبّت اور وہ بھی غیر مشروط
بہت مشکل ہے ایسے مہرباں سے

نکالی بھی گئی تھیں سوئیاں کیا
کوئی تصدیق کرتا قصّہ خواں سے

میں اِک اِک تیر پر خود ڈھال بنتی
اگر ہوتا وہ دُشمن کی کماں سے

جو سبزہ دیکھ کر خیمے لگائیں
انہیں تکلیف کیوں پہنچے خزاں سے

جو اپنے پیڑ جلتے چھوڑ جائیں
انہیں کیا حق کہ رُوٹھیں باغباں سے

چراغ میلے سے باہر رکھا گیا وہ بھی
ہوا کی طرح سے نامعتبر رہا وہ بھی

زمین زاد بھی بھولا جو لفظِ ربداری
فصیلِ شہر سے باہر کھڑا رہا وہ بھی

میں اُس کے سارے رویّوں پہ معترض ہوتی
مری طرح سے مگر تھا دُکھا ہوا وہ بھی

گلی کے موڑ پہ دیکھا اُسے تو کیسی خوشی
کسی کے واسطے ہوگا رُکا ہوا وہ بھی

میں اُس کی کھوج میں دیوانہ وار پھرتی رہی
اسی لگن سے کبھی مجھ کو ڈھونڈتا وہ بھی

نظر بھی آیا اُسے اپنے پاس بھی دیکھا
مری نگاہ نے یہ التباس بھی دیکھا

بہت دنوں پہ چلے اور گھر سے چلتے وقت
کسی کی آنکھ سے اپنا لباس بھی دیکھا

یہی کہا کہ نہیں اُس کا راستہ تھا الگ
پھر اُس کے بعد ہی خود کو اُداس بھی دیکھا

مقابلے پہ زمانے کے آگئے اور پھر
بہ پیشِ آئینہ دل کا ہراس بھی دیکھا

وہ مجھ میں سوچ کے کس زاویے سے روشن ہو
یقیں بھی دیکھ لیا ہے، قیاس بھی دیکھا

سب اچھا کہتے ہوؤں کا ہراس بھی دیکھا
امیرِ شہر، کبھی آس پاس بھی دیکھا

جو پیڑ اہلِ گلستاں کا ستر ڈھکتا رہا
اُنہی کے ہاتھوں، اُسے بے لباس بھی دیکھا

جو صبح سرمد و منصور تھے، انہیں سرِ شام
حضورِ شاہ سراپا سپاس بھی دیکھا

تمام رات جو خندق میں ریت بھرتا رہا
اُسی کو شہر کی خاطر اداس بھی دیکھا

کھُلا کسی پہ نہ جس کا کبھی سیاق و سباق
کتابِ زیست میں وہ اقتباس بھی دیکھا

ایک غیر زمینی رات

جاڑے کی اُداس چاندنی میں
راوی کے حسین پانیوں میں
اِک ناؤ خموش بہہ رہی تھی
کشتی کے شکستہ دل مسافر
دریا کے سکوت سے ہراساں
ماحول کی طرح دم بخود تھے

ایک غیر زمینی دلکشی نے
بانہوں میں سبھوں کو لے لیا تھا
اِک نُور تھا کوئی ماورائی
جو پردۂ غم ہٹا رہا تھا
سب زخم پرانے جاگ اُٹھے تھے
دُکھ آنکھوں میں ایسے آ گئے تھے
ہم خود سے نظر چُرا رہے تھے!

ایک خوبصورت ڈرائیو

اسی راستے پر
میں کب سے سفر کر رہی تھی
کبھی نیم تنہا
کبھی دوستوں کی معیت میں
اور کبھی
اس طرح بھی
کہ چلتی رہی اور ذرا سمت تک جاننے کی ضرورت نہ سمجھی

مگر آج اک اجنبی کے
دلآویز، کم بولتے ساتھ میں
ستمبر کی تپتی ہوئی دوپہر میں
میں نے پہلی دفعہ یہ بھی دیکھا
کہ اس راستے پر
دو رویہ گلابوں کے تختے بچھے ہیں!

آج کی رات

آج کی رات تو سونے کی نہیں ہے جاناں!
آج کی رات ہے تجدیدِ ملاقات کی رات
العطش کہتے ہُوئے جسم کی
پیہم آواز
الاماں کہتی ہُوئی روح کی
بے چین صدا
تیز بارش کی دُعاؤں میں تجھے یاد کئے
ایک مُدت سے لیے بوجھ دلِ خستہ پر
تیری خواہش کا، ترے قرب کی آسائش کا

ساتھ دیکھے ہُوئے خوابوں کا نشہ آنکھوں میں
ساتھ سوچی ہُوئی باتوں کی دھنک نظروں میں
رات کے ہاتھ میں کیا ہاتھ دیا ہے دل نے
پاؤں پڑتے ہی نہیں جیسے زمیں پر اس کے
روشنی کیسی رگ و پے میں اُتر آئی ہے
دُور تک صرف تری شکل نظر آتی ہے
میرے ہاتھوں میں ترے چہرے کا بے داغ کنول
تازہ بارش میں تو کچھ اور کھلا جاتا ہے
میری آنکھیں
ترے ہونٹوں کی نمی سے سرشار
ساری دُنیا سے چھپائے
تری بانہوں کا حصار
ذہن میں گھومتا ہے پہلے پہل کا ملنا
اور پھر رنگِ ملاقات کا گہرا ہونا
اور پھر ملنے کی خواہش کا سمندر ہونا

دھیرے دھیرے
کسی تصویر کے ٹکڑے ملنا
جس کی ترتیب نے دو روحوں کا سمبندھ کیا
اور یہ سچ ہے
کہ حیرت کدۂ ہستی میں
ایک پہچان کا لمحہ بھی بہت ہوتا ہے
ہم پہ اُس لمحے کا کچھ قرض ہے باقی اب تک
تن میں تن جذب کریں
روح میں روح سموئیں
کہ یہ ساعت ہے تشکّر کے لئے
ریگِ صحرا پہ اُتر آئی ہے برسات کی رات
آج کی رات ہے تجدیدِ ملاقات کی رات!

وہ مجبوری نہیں تھی، یہ اداکاری نہیں ہے
مگر دونوں طرف پہلی سی سرشاری نہیں ہے

بہانے سے اُسے بس دیکھ آنا پل دو پل کو
یہ فردِ جُرم ہے اور آنکھ انکاری نہیں ہے

میں تیری سرد مہری سے ذرا بددِل نہیں ہوں
مرے دشمن! ترا یہ وار بھی کاری نہیں ہے

میں اُس کے قول پر ایمان لا کر خوف میں ہوں
کہیں لہجے میں تو ظالم کے عیاری نہیں ہے

پلٹنے کا ارادہ ہو سکے تو تم بھی کر لو !
یہ بازی آج تک دل نے کبھی ہاری نہیں ہے

جہاں اِک روز کھل جائیں ہمارے نام کے پھول
بھرے گلشن میں کیا ایسی کوئی کیاری نہیں ہے

سکوتِ شہر تو پھر بھی سمجھ میں آ رہا ہے
پسِ دیوار بھی کیا گریہ و زاری نہیں ہے

بچھڑنے والے اتنے ہو گئے ہیں شہر در شہر
کہ باقی اب کسی گھر میں عزاداری نہیں ہے

مرنے سے بھی پہلے مر گئے تھے
جینے سے کچھ ایسے ڈر گئے تھے

رستے میں جہاں تلک دیے تھے
سارے مرے ہم سفر گئے تھے

آنکھیں ابھی کھل نہیں سکی تھیں
اور خواب مرے بکھر گئے تھے

جب تک نہ کھلا تھا اُس کا وعدہ
موسم مرے بے ثمر گئے تھے

گرداب سے بچنے والوں کی سمت
ساحل سے کئی بھنور گئے تھے

ق

اب تک وہی نشّہ پذیرائی
کل خواب میں اُس کے گھر گئے تھے

مِلتا نہ تھا واپسی کا رستہ
کیا جانیے ہم کدھر گئے تھے

ایک شاعرہ کے لیے

بھیڑیے اور ہرنی کی دوستی کبھی نہیں ممکن ہے
ذرا سی چھاؤں کی آس میں تُو نے
کیسے گھر کو چھوڑا
مانا کہ دیوار تھی کچّی
اور ٹپکتی رہتی تھی چھت
خواب گاہ میں شام شام تک دھوپ بھری رہتی تھی
لیکن وہ مٹّی جس پر یہ گھر استادہ تھا
جس پر تیرے پاؤں جمے تھے

وہ تو تیری اپنی تھی

سدا محبت کرنے والی

ماں کی طرح، ترے سب تیکھے لہجوں کو

ہنس ہنس کے سہہ جاتی تھی

تیرا آنچل

جب بھی کسی کانٹے سے اُلجھا

یا تیری بے خبری میں سر سے ڈھلکا

کون تھا جس نے تیری ردائے عفت ڈھونڈی

آندھی اور سیلاب کے بڑھتے ریلے میں

تیرے وجود کے ننھے سے پتے کو کس نے تھاما تھا

شہر کا شہر جب تجھ پہ باتیں کرتا تھا

کس نے تیرے سر پر ہاتھ رکھا تھا

جب بھی بارش تیز ہوئی تو تیری خاطر

کس کے بازو پھیلے تھے

جب بھی زور ہوا نے باندھا